محمد علی جوہر اور مہاتما گاندھی

عبدالحی

C-183، تھرڈ فلور، ڈائمنڈ اپارٹمنٹ، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

میں درجہ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں آزادی کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں۔ برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے، لیکن ۳۳ کروڑ کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کرلی ہے، اسے مار ڈالنا کچھ آسان نہیں۔ اصلی مسئلہ اس وقت ہندو مسلم مفاہمت کا ہے۔ دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنا اب ایک بھولا ہوا خواب ہے۔ میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں۔ اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں۔ اگر آپ نے یہ نہ دیا تو میرے لیے اپنے یہاں قبر کی جگہ دیجیے۔

(محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق: عبدالماجد دریابادی)

یہ الفاظ اس مرد مجاہد کے تھے جس نے غلام ملک میں جانا گوارا نہ کیا اور برطانیہ میں ہی آخری سانس لی۔ اس مجاہد آزادی کو دنیا محمد علی جوہر کے نام سے جانتی ہے۔ ہندوستان ہمیشہ سے ہی عظیم ہستیوں کا ملک رہا ہے اور یہاں بڑے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جنھیں رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے سیکڑوں ہزاروں جیالوں نے اپنی قربانیاں دی ہیں تب کہیں جا کر ہمارا ملک آزاد ہوا اور آج خوشحالی و ترقی کی نئی تاریخ لکھ کر رہا ہے۔ ایسے جیالے نہ صرف ملک وملت کی بہتری کے لیے کوشش کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسل بھی ان رہنماؤں سے ترغیب حاصل کرتی ہے اور ان جیسا بننے کی کوشش کرتی ہے۔

ہندوستان کو آزادی دلانے میں مختلف تحریکوں اور آندولنوں نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے جس میں تحریک خلافت بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ حسرت موہانی، شوکت علی، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد جیسے وطن پرست رہنماؤں کی وجہ سے اس تحریک کو کافی مضبوطی حاصل ہوئی۔ تحریک خلافت کے کچھ جیالے ایسے تھے جن کے پورے گھر والے اس تحریک میں شامل رہے اور ملک کی حفاظت کے لیے ہمیشہ ڈٹے رہے۔ ایسے ہی جیالوں میں محمد علی جوہر، شوکت علی اور آبادی بانو بیگم (بی اماں) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر اس معاملے میں بھی ممتاز رہے کہ یہ واحد مجاہد آزادی تھے جن کے گھر کے تین افراد (شوکت علی، محمد علی اور بی اماں) نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

مولانا محمد علی جوہر کو نڈر اور صاحب طرز صحافی، بہادر مجاہد آزادی، کامیاب سیاست داں، بہترین مقرر اور عظیم

شاعر اور سچا مسلمان بنانے میں ان کی والدہ بی اماں کا بڑا رول تھا۔انھوں نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ بیٹا اسلام اور وطن دونوں کی سلامتی کے لیے کبھی جھکنا نہیں بلکہ ہمیشہ سینہ تان کر تمھیں سامنے رہنا ہے اور ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرنی ہیں۔اس دور میں سہارن پور کے شاعر نور احمد نور نے نظم ''صدائے خاتون'' لکھی تھی جس نے تحریک خلافت میں ایک نئی جان ڈال دی۔اسی نظم کا یہ مشہور شعر اس وقت گھر گھر میں مشہور تھا:

بولیں اماں محمد علی کی۔جان بیٹا خلافت پہ دے دو

علی برادران کی تربیت و پرورش ہی کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ وہ جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے قوم اور ملک وملت کا درد ان کے دلوں میں بڑھتا چلا گیا۔محمد علی ۱۰/ دسمبر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئے۔والد کی وفات کے وقت سب سے چھوٹے بیٹے محمد علی کی عمر محض پونے دو سال تھی۔محمد علی کی والدہ بی اماں نے کوئی اسکول یا مکتب سے تعلیم نہیں حاصل کی تھی صرف قرآن پاک پڑھا تھا۔شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور تحریک خلافت کے جلسوں میں زبردست مقررہ بن کر ابھریں۔بی اماں نے بھلے ہی اسکولی تعلیم نہ حاصل کی ہو،لیکن ایک مثالی مشرقی خاتون کی طرح انھوں نے گھر سنبھالا اور بچوں کی بہتر پرورش کی،ان کی تمام فرمائشوں کو پورا کیا خود روکھی سوکھی کھائی،لیکن بچوں کو اعلیٰ اور معیاری تعلیم دلوائی۔شوکت علی کو بے مثال عقل وشعور عطا کرنے اور محمد علی کو تراش کر جوہر بنانے میں بی اماں کا ہی رول رہا ہے۔قوم کی خدمت کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر دیا اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔محمد علی بھی بی اماں کی محبت وشفقت کا اعتراف کرتے ہیں:

''مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں،مگر والدہ صاحبہ کو کبھی نہیں بھول سکتا.....میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے پہنچایا ہے۔''

انھوں نے بچوں کو بریلی اسکول میں پڑھنے بھیجا۔وہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کے بچے علی گڑھ پڑھنے گئے اور تعلیم کے میدان میں ان کے بچوں شوکت علی اور محمد علی نے ایک ریکارڈ قائم کیا۔شوکت علی رامپور کے سب سے پہلے یونیورسٹی گریجویٹ بنے اور محمد علی کو آکسفورڈ سے پہلے گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

آکسفورڈ سے واپسی کے بعد محمد علی کو رامپور میں ایک معزز عہدے پر ملازمت مل گئی،لیکن محمد علی کے دل میں تو کچھ اور ہی پک رہا تھا۔انھیں تو ملک وقوم کے لیے بڑے کارنامے انجام دینے تھے اس لیے میدان صحافت میں آئے،ساتھ ہی ایوان سیاست میں بھی قدم رکھا۔مسلم لیگ کا قیام کیا اور جنگ آزادی میں شامل ہو گئے۔۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے صدر بنائے گئے۔صدر بننے پر ان کا یہ شعر دینا مناسب ہوگا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
لیکن صلہ روز جزا اور ہی کچھ ہے

تحریک آزادی میں سرگرمی سے حصہ لینے کے جرم میں انھیں دو دفعہ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۱ء میں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض

سے لندن گئے اور وہیں ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو اس دار فانی کو الوداع کہا۔ وہاں سے انھیں بیت المقدس لے جایا گیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

۱۱؍مئی ۱۹۲۱ء کو الہٰ آباد کانفرنس میں محمد علی نے ایک طویل تقریر کی تھی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں اور انگریز سرکار دونوں کو بانٹ کر حکومت کرنا چاہ رہی ہے جسے ہم سب ہندوستانیوں کو ایک ہوکر انگریزوں کی اس پالیسی کو ناکام بنادینا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں مہاتما گاندھی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مہاتما جی ایک قدم آگے ہیں اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ برٹش حکومت کو ہم کبھی مدد نہیں دیں گے چاہے اس حکومت پر کوئی دشمن ملک حملہ بھی کردے۔ محمد علی جوہر نے اسی تقریر میں یہ بھی کہا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مہاتما گاندھی سے دونوں علی برادران بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کے اہنسا کے اصولوں کو پسند کرتے تھے۔ انگریز حکومت کو یہ غلط فہمی تھی محمد علی جوہر کی جوشیلی تقریریں عوام کو اکساتی ہیں اور انہیں غصہ دلاتی ہیں۔ انہی دنوں پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوشش سے انگریز وائسرائے لارڈ کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں لارڈ ریڈنگ نے مہاتما گاندھی سے شکایت کی کہ محمد علی اور شوکت علی کی تقریریں لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتی ہیں۔ اس پر مہاتما گاندھی نے فوراً کہا کہ بالکل نہیں وہ دونوں امن پسند ہیں اور تشدد کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اس میٹنگ کے کچھ دنوں بعد ہی دونوں بھائیوں نے مہاتما گاندھی کے کہنے پر ایک بیان جاری کرکے کہا کہ ہم دونوں امن پسند ہیں اور اہنسا کے اصولوں کو مانتے ہیں اور ہماری تقریر سے غلط مطلب نکالا گیا ہے۔ اس بیان کو علی برادران کی معافی تصور کرلیا گیا جب کہ ایسا نہیں تھا۔

مہاتما گاندھی کو محمد علی جوہر باپو کہہ کر بلاتے تھے اور انھیں اپنی والدہ سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اور پیر و مرشد کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک واقعہ ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر محمد علی جوہر نے گاندھی جی کو ایک گائے تحفے میں بھیجی تھی، جس کے جواب میں گاندھی جی نے ایک خط لکھا تھا اس کے اقتباس پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی ان سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ وہ خط یوں تھا:

پیارے بھائی تم مجھے بھائی سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ جب گائے آئی تو میرا پلنگ کسی قدر اٹھادیا گیا۔ اس لیے میں اس کو بخوبی دیکھ سکا۔ وہ محبت کیسی ہوگی جس نے تمہیں اس تحفہ کو پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ خدا کرے جو محبت میرے اور تم دونوں بھائیوں کے درمیان ہے وہی رشتۂ الفت نہایت مضبوطی سے دونوں مذہبوں، مادر وطن اور انسانیت کی بہتری کی خاطر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی قائم ہوجائے۔ بے شک خدا بڑا ہے اور عجائب ظاہر کرسکتا ہے۔

گاندھی جی سے ان کی محبت کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں گاندھی جی کا خوب خوب ذکر کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے کچھ مسلمان انھیں ہندو پرست تک کہنے لگے۔ اس اعتراض پر محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں

لکھا تھا:

واقعی میں مہاتما گاندھی کو ان کے اخلاق و عادات کے لحاظ سے آج کل دنیا میں سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں۔

محمد علی جوہر پر گاندھی کے حامی ہونے کا ایسا الزام لگا کہ لوگ ان کے مذہبی عقائد پر بھی شک کرنے لگے۔ ایسی صورتحال میں محمد علی نے یوں صفائی دی:

میں گاندھی جی کی نہ روحانیت کا قائل ہوں نہ ان کے کشف و کرامات کا۔ نہ ان کا شمار اولیا اللہ میں کرتا ہوں۔ ان کا مذہب الگ، میرا مذہب الگ، ہاں انھیں اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتا ہوں۔ وہ اس وقت ملک کے سب سے بڑے اور مخلص رہنما ہیں۔ (ذاتی ڈائری، جلد اول، ص:۱۰۱)

مولانا محمد علی جوہر کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۰۴ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۰۴ء میں الٰہ آباد سے گپ نامی پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا اور پھر ۱۹۰۶ء میں ایک کتابچہ گرین بک کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ اخبار 'کامریڈ' کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہوتا ہے پھر ۱۹۱۳ء میں اردو روزنامہ ہمدرد کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرنا کے عنوان پر دوسرا کتابچہ شائع کیا جسے حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ کچھ دنوں کے بعد کامریڈ اور ہمدرد کے پریس سے ضمانت طلب کی گئی کیوں کہ یہ دونوں اخبارات انگریزوں کے خلاف خوب لکھ رہے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کی صحافت کا مقصد ملک وملت کی خدمت تھا۔ اپنے اخبار ہمدرد میں وہ لکھتے ہیں:

صحافت سے میری غرض صحافت نہیں بلکہ ملک وملت کی خدمت ہے۔ (ہمدرد، دہلی، ۲۳؍جنوری ۱۹۲۸ء)

محمد علی جوہر کی صحافتی زندگی میں دو تین باتیں انھیں دیگر صحافیوں سے ممتاز بناتی ہیں۔ اوّل یہ کہ انھوں نے صحافت کو ایک مشن کے طور پر برتا، دوم یہ کہ انھوں نے اخبار کی ریڈرشپ بڑھانے کے لیے کبھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ ہمیشہ انگریزوں کے خلاف کھل کر لکھتے رہے۔ صحافت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ سچائی پر چل کر عوام کو باخبر کیا جائے، انھیں بیدار کیا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ صحافت کے اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو اس پر بھی آواز اٹھائی جائے۔ اپنے اخبار کے ذریعے مسلمانوں کے دل سے انگریزی حکومت کا ڈر اور خوف کم کیا۔ انھوں نے باقاعدہ مشن کے طور پر ملک میں ہو رہے ہر چھوٹے بڑے حادثے کا نوٹس لیا اور اس پر ہمدرد میں اداریہ لکھا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم صحافی تھے بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ صحافت کو انھوں نے ایک بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اپنی ۵۳ برس کی زندگی میں انھوں نے صحافت کو محض ۱۲ برس دیے، لیکن اتنے کم وقفے میں بھی انھوں نے صحافت کو نئی جہت عطا کی اور ہمیشہ سچائی کے اصولوں پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ اردو صحافت اور ملک کی سیاسی تاریخ مولانا محمد علی جوہر کی صحافت کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔

OO